ڈاکٹر مرزا معین الدین

زبانی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ: 'نابر کہانی'

لوک ادب پر تحقیق کا آغاز مستشرقین نے کیا۔ کالونیل عہد میں اِس کے مقاصد یقینی طور پر مقامی ادب کی تعریف و توصیف نہیں تھے بلکہ مقامی باشندوں کی نفسیات کو سمجھنا اور اُس کی روشنی میں اُن پر حکمرانی کرنا تھے۔ لوگوں کو یہ کہہ کر دبانا تھا کہ تم اُجڈ، گنوار اور تہذیب وتمدن سے عاری ہو۔ تمہارا کوئی علمی ورثہ نہیں ہے۔ ہم تم لوگوں کو علم دینے اور تربیت کرنے آئے ہیں تا کہ تمھیں جہالت کی پستی سے نکالا جا سکے۔ سامراجی طاقت نے ہمیشہ اپنی زبان اور علم وادب کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور محکوم قوم کی زبان، ادب، سائنس، مذہب اور معاشرتی اقدار کو ہدفِ تنقید بنایا۔ سکھر اوَ، فیروز پور، علی وال، چیلیاں والی، گجرات اور ملتان کی لڑائیوں، 1857ء کی جنگِ آزادی جسے بغاوت کہا جاتا ہے، کے بعد پنجابیوں اور پنجابیت کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں ہم نے کالونیل حکمرانوں سے آزادی تو حاصل کر لی مگر انگریز بہادر کی پنجابی زبان اور ادب سے متعلق پھیلائی ہوئی نفرت سے آج تک پیچھا نہ چھڑا سکے۔ اس نفرت کی جڑیں پنجابی اذہان میں اس قدر پیوست ہوئیں کہ خود پنجابیوں نے اپنی زبان، ادب اور ثقافت سے نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

تقسیم ہند کے بعد پنجابی دانشوروں کی توجہ کا محور کلاسیکی اور نو کلاسیکی ادب ہی رہا ہے۔ لوک ادب پر کام کرنے والوں کی توجہ کا مرکز لوک گیت، ڈھولے، ضرب الامثال اور پہیلیاں رہی ہیں۔ 'لوک کہانیاں' اور 'لوک واریں' جن سے پنجاب کی حقیقی تاریخ سامنے لائی جا سکتی تھی، پر کام نہیں کیا گیا۔ کہانی کے موضوع میں بہت تنوع ہے اس لیے اگر کسی نے اِس موضوع کو چھوا بھی تو تفننِ طبع کی غرض سے جنوں، بھوتوں، پریوں، بادشاہوں اور جادوگروں کی کہانیوں کو مدوّن کیا۔ پنجابیت کو اس سے فائدہ نہ ہوا بلکہ وہ اپنی پہچان سے ایک بار بھٹک گئے۔

عہدِ حاضر میں لوک ادب پر تحقیق کرنے والوں میں اہم نام ڈاکٹر سعید بھٹا کا ہے جنھوں نے پنجابی اور پنجابیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا ہے۔ اِس موضوع پر اُن کی اب تک تین کُتب 'کمال کہانی'، 'دیس دیاں واراں' اور 'نابر کہانی' اہلِ دانش سے دادِ تحسین پا چکی ہیں۔ 'بار کہانی' اور اس نوع کی دیگر کتب منتظرِ طباعت ہیں۔

کہانی کا لفظ سنتے ہی ذہن کسی قصے یا واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ 'نابر کہانی' کی ترکیب جب ذہن سے ٹکراتی ہے تو بادی النظر میں یہی سوچ اُبھرتی ہے۔ مگر حقیقت میں یہ 'زبانی تاریخ' ہے۔ 'نابر کہانی' اصل میں بار کی تاریخ اور تہذیب وتمدن کی امین ہے۔ زبانی تاریخ کو مصدقہ نہیں سمجھا جاتا۔ واقعات کی شہادت وصحت کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سعید بھٹا نے 'نابر کہانی' مرتب کرتے وقت سب سے زیادہ جس بات پر توجہ دی وہ زبانی روایت، متن، واقعات کی شہادت اور اُن کی صحت ہے۔ اس طرح تفتیش کے جس طریقہ کار کو اختیار کیا گیا، انتہائی سائنسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'نابر کہانی' سے جو تاریخ مرتب ہوئی ہے وہ تحریری تاریخ کے ماخذات سے زیادہ قابلِ بھروسا معلوم ہوتی ہے۔

تاریخ نویسی کا فن ہمیشہ حاکموں کا پابند رہا ہے۔ جس طرح حاکم نے چاہا مؤرخ نے لکھ دیا۔ پروفیشنل مؤرخین کی کتبِ تاریخ سے وقت کی سچائی کو ڈھونڈنا ایسا آسان کام نہیں۔ قاری تاریخ کے جھروکوں سے سچائی نہیں ڈھونڈ پاتا بلکہ مورخین کی بنائی ہوئی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ زبانی تاریخ دان کے پاس سچ ہی سچ ہے۔ وہ سچ کو پوری ایمانداری کے ساتھ نسل در نسل سینہ بہ سینہ منتقل کرتا آ رہا ہے۔ 'نابر کہانی' زبانی تاریخ ہے۔ راجا پورس اور احمد خان کھرل کی کہانیاں سینکڑوں

سال گزر جانے کے بعد بھی غیر جانبدار مؤرخ کی تاریخ سے مختلف نہیں۔ دونوں کے ہاں واقعات کی سچائی یکساں ملتی ہے۔

جنگِ آزادی 1857ء کو پروفیشنل مؤرخین نے دِلی اور اُس کے قرب و جوار میں دکھایا ہے۔ 'بار' کو آزادی کی جنگ سے الگ رکھا گیا مگر ہمارا 'زبانی مؤرخ' تاریخ کے حقائق کو اس کے صحیح تناظر میں سنبھال کر بیٹھا ہوا ہے۔ زبانی مؤرخ نے حقائق پر پڑے پردوں کو ہٹایا ہے، سچ کو بے نقاب کیا ہے۔ انگریز بہادر کی لکھی ہوئی تاریخ اور رپورٹس زبانی مؤرخ کی سچائی کے سامنے ہیچ دکھائی دیتی ہیں۔

بار واسیوں کے بارے میں ولایتی سوچ یہ تھی کہ بار کے لوگ اُجڈ، گنوار اور وحشی ہیں۔ عقل و شعور کا اُن کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ 'بار' جنگل ہے اور یہاں کے لوگ 'جانگلی'! گورے کے پاس اس تضحیک کا سبب بغاوت ہے۔ جن قوموں نے کمپنی کی حکومت کے خلاف بغاوت کی، سامراجی قوت نے ان کو اِنہی القابات سے نوازا۔ یہی نفرت بعد میں حکومتی وفاداروں کے ذریعے عوام میں پھیلی جس کو آج تک دیکھا جا سکتا ہے۔ زبانی تاریخ کو پھیلا کر ہی اس نظریے کے زہر کو کم کیا جا سکتا ہے۔ 'بار' کے علاقے قبائلی نظام پر پھلے پھولے تھے اور ہیں۔ قبائلی نظام کی اپنی اقدار، روایات، تہذیب و تمدن، معاشرت اور علم و دانش ہوتی ہے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں یہی معاشرتی، تہذیبی و تمدنی شعور تھا جس نے 'بار' کے قبائل کو سامراجی قوت کے خلاف متحد کیا۔ خود سامراجی قوت 'بار' کے قبائل کی جنگی حکمتِ عملی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔

'نابر کہانی' کی تمام کہانیاں 'بار' کے لوگوں کے مزاج اور نفسیات کی امین ہیں۔ 'بار' کے راٹھ اپنی رعیت کے ساتھ حُسنِ سلوک رکھتے ہیں۔ اُن کا دُکھ اپنا سمجھتے ہیں۔ راٹھ تو ہے ہی وہ جو کمزوروں کو ڈھاسنا دے نہ کہ اُن کی کمزوری سے فائدہ اُٹھائے۔ احمد خان کھرل شہید ایسا ہی راٹھ کردار ہے جو 'بار' کی مکمل نفسیات کے ساتھ آشکار ہوتا ہے۔ بلاشبہ احمد خان کھرل شہید ایک طرف 'بار' کی اَنا اور تمدنی روایات کی سنبھال اور دوسری طرف بہادری اور عزم و استقلال کا استعارہ ہے۔

'احمد خان دا سر' پنجابیت کے احیاء کی کہانی ہے۔ 1968ء میں کھرل شہید کے مزار کی تعمیر و آرائش کے وقت احمد خان کا سر ملا جس کی تدفین دھڑ کے ساتھ جوڑ کر کی گئی۔ احمد خان کھرل شہید کا سر تن سے جُدا کرنے کا کوئی بھی مقصد ہو، اصل میں دھڑ ایک سٹیٹ کی مانند ہے۔ جسم کی سٹیٹ کو سر چلاتا ہے۔ سماجی معاشرتی سٹیٹ کو سردار چلاتے ہیں۔ سرداری سروں (عقل و دانش) سے جڑی ہوئی ہے۔ ٹھیک سو سال بعد پنجاب کے اس حصے نے جس میں جنگِ آزادی لڑی گئی، اپنی بقاء جنگِ آزادی کے ہیرو کے نظریات کے احیاء میں ڈھونڈنا شروع کر دی ہے۔

ڈاکٹر سعید بھٹا بلاشبہ داد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے بڑے لوگوں کے کارناموں کی تاریخ کو موضوع بنایا۔ اُنھوں نے عام آدمی (Street Man) کی معاشرتی و نفسیاتی زندگی سے عبارت تاریخ کو اکٹھا کیا اور اِس نظریے کو رد کر دیا کہ 'بار' کی قبائلی زندگی متمدن نہیں تھی۔